© rasailojaraid.com

وحیِ الٰہی

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی

(۳)

قرآن مجید کا مع الفاظ عربی کے کلامِ الٰہی سمجھنا اس امر پر موقوف ہے کہ ربطِ حادث بالقدیم کی حقیقت کو پورے طور پر سمجھ لیا جائے۔ اور یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ ایک شئے حادث کس طرح کسی امرِ قدیم کا مظہر بننے کے بعد اُس قدیم کی صفت بنتی ہے۔ اور اُس کا قدیم پر محمول ہونا کس طرح درست ہو جاتا ہے، گذشتہ نمبر میں ایک مثال کے ذریعہ ربطِ حادث بالقدیم کے مسئلہ پر اجمالی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں مزید دو مثالوں سے اس کی اور توضیح وتشریح کی جاتی ہے۔

آپ روزانہ دیکھتے ہیں کہ کسی ریڈیو اسٹیشن سے ایک تقریر نشر کی جاتی ہے۔ اور آپ اسے اپنے ریڈیو سیٹ میں سُنتے ہیں۔ ریڈیو سیٹ میں ایک پیچ لگا ہوا ہوتا ہے جس کے ذریعہ آواز کو پست اور بلند کیا جا سکتا ہے۔ اب دیکھیے مقرر کی آواز کا جہاں تک تعلق ہے وہ بالکل یکساں ہے۔ یعنی وہ ایک ہی آواز سے اول سے آخر تک اپنی تقریر کو پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اُس میں نہ تیزی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہلکا پن لیکن ادھر حال یہ ہے کہ آپ پیچ کو دو ایک چکر دیتے ہیں تو آواز ہلکی ہلکی سُنائی دیتی ہے۔ اور اگر اُس کو زیادہ گھماتے ہیں تو آواز تیز ہو جاتی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ آواز کا ہلکا ہونا یا تیز ہونا آواز کی ذاتیات میں داخل نہیں ہے اور آپ کے پیچ گھمانے سے مقرر کی اصل آواز میں کوئی تغیر بھی پیدا نہیں ہوتا، لیکن اس کے باوجود یہ ہلکا پن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا تیزی صفت آواز کی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ بڑی بے تکلفی سے فرماتے ہیں "آواز ہلکی ہوگئی" یا "آواز تیز ہوگئی" دوسری مثال یہ ہے کہ آفتاب کی روشنی اگر کسی مثلث قسم کے روشندان میں سے گذرتی ہے تو خود اُس روشنی کی شکل بھی مثلث ہوجاتی ہے۔ اور اگر وہ کسی مربع شکل کے روشندان میں سے گذرے تو اُس کی شکل بھی مربع بن جاتی ہے اب غور کیجیے۔ آفتاب کی روشنی ایک ہی ہے۔ اُس کے لیے نہ مثلث ہونا پایا جاتا ہے اور نہ مربع ہونا لیکن اس کے باوجود اُس کا گذر جس کسی قسم کے روشندان میں سے ہوتا ہے وہ وہی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اور اگرچہ وہ اب بھی غیر متغیر اور غیر متبدل ہے لیکن مظہر (روشندان) کے لحاظ سے اُس کو جو شکل خاص حاصل ہورہی ہے اُس کا حمل و انصاف آفتاب کی روشنی کے لیے ہی ہے۔ چنانچہ آپ کہتے ہیں "یہ روشنی مثلث الشکل ہے اور یہ مربع" پس یہی حال کلامِ الٰہی کا ہے جس طرح آواز کے غیر متبدل ہونے کے باوجود مظہر کے اعتبار سے اُس کے لیے ہلکا یا تیز ہونا پایا جاتا ہے، یا جس طرح آفتاب کی روشنی اپنی اصلی حقیقت کے اعتبار سے کوئی شکل خاص نہیں رکھتی لیکن مظاہر مختلفہ کے لحاظ سے اُس کے لیے متعدد اشکال کے ساتھ قائم ہونا پایا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اللہ کی صفتِ کلام ازلی ہے ابدی ہے اُس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں، اُس کے لیے نہ عربی الفاظ ہیں اور نہ عبرانی۔ اُس میں نہ الفاظ کا تقدم و تاخر ہے اور نہ حروف کی ترتیب و ترکیب لیکن اس کے باوجود اُس کا مظہر حوادث ہیں۔ اور اُن حوادث کے مختلف حالات و کیفیات کے اعتبار سے صفتِ کلام ربانی کا ظہور و بروز بھی دنیا کی مختلف زبانوں اور بولیوں میں ہوتا رہا ہے ان حوادث میں اور صفتِ کلام میں وہی تعلق ہے جو ظاہر اور مظہر میں یا متجلی اور متجلی فیہ میں ہوتا ہے۔ یا سابق الذکر مثالوں کے پیشِ نظر "آواز" اور "ہلکے پن یا تیزی" میں اور آفتاب کی روشنی اور اُس شکل خاص میں جو اُسے ایک خاص روشندان میں سے گذرنے کی وجہ سے حاصل ہوگئی ہے۔ جس طرح آپ آواز کی تیزی کو آواز سے جدا نہیں کرسکتے، حالانکہ وہ نفس آواز سے جدا بھی ہے۔ اور جس طرح آپ مثلث شکل کو روشنی سے الگ نہیں کرسکتے، اگرچہ وہ روشنی کی ذات کے ساتھ قائم بھی نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح آپ قرآنِ مجید کے الفاظ عربی کو جو کسی انسانی زبان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پرآنے سے پہلے بھی اپنے معانی کے ساتھ قائم تھے۔ آپ خدا کی صفتِ کلام سے جُدا نہیں کرسکتے۔ حالانکہ وہ اصل صفت سے جُدا بھی ہیں۔ پانی اُسی وقت تک پانی ہے جب تک کہ وہ دودھ کے ساتھ نہ ملا یا گیا ہو لیکن دودھ میں ملجانے کے بعد وہ پانی پانی نہیں رہتا بلکہ دودھ بن جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ اسی گاڑھا دودھ نہ کہیں بلکہ پتلا کہیں۔ پس اسی طرح قرآن مجید کے عربی الفاظ اپنے تمام اوصافِ حدوث وترکیب وغیرہ کے ساتھ اُسی وقت تک قائم تھے جب تک کہ وہ خدا کی صفتِ کلام کا مظہر نہیں بنے تھے لیکن جب خدا نے انھیں اپنی صفتِ کلام کا مظہر ومجلا بنا لیا تو اب کسی احمق سے احمق کو بھی مطلقاً یہ حق نہیں ہے کہ وہ پھر بھی ان الفاظ کو اپنے جیسے الفاظ پر ہی قیاس کرتا رہے اور انہیں اب بھی اُن اوصاف سے متصف مانے جن اوصاف سے خود اس کا اپنا کلام ہوتا ہے۔

کون نہیں جانتا دنیا کی معمولی سے معمولی چیز بھی کسی عظیم المرتبت شخصیت کی طرف منسوب ہوتی ہے تو وہ کچھ سے کچھ بنجاتی ہے، جب یہ مسلم ہے کہ خدا کی صفات کا مظہر حوادث بنتے ہیں، تو پھر آپ کو اس پر کیوں اصرار ہے کہ وہ حوادث مظہر صفات بننے کے بعد بھی عام حوادث کی طرح ہی رہینگے۔ مرزا غالب نے تو محض شاعرانہ انداز میں کہا تھا۔

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں　　　کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

لیکن اگر آپ غالب کے اس تصور کو قوی تر بن کرکے اپنے دل و دماغ پر اس کی تمام کیفیات طاری کرلیں تو پھر یہ محض شاعری نہ رہیگی بلکہ واقعی وہ ایک حقیقتِ نفس الامری بن جائیگی۔ پس اگر خوئے یار سے مشابہت کسی عاشقِ ستم کوش کے لیے آگ کو جلانے اور ایذا پہنچانے کا ذریعہ بننے کے بجائے راحت رسانی کا سامان بنا سکتی ہے تو عربی زبان کے چند الفاظ کا خدا کی صفت کلام کا مظہر بننا کیوں انہیں عام عربی الفاظ کے اوصاف سے جدا نہیں کرسکتا۔

کلام الٰہی کی صورتیں جب یہ معلوم ہوگیا کہ خدا کی صفت کلام اُس کی دوسری صفات کی طرح حوادث کی صورتوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں متجلی اور ظاہر ہو سکتی ہے، اور اس تجلی فی الحوادث سے اُس کی ذات لم یزل ولا یزال میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ تو آیئے اب دیکھیں کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق خدا کا کلام انسانوں تک کن کن ذرائع سے پہنچتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام کی چند صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ ارشاد ہے۔

وما کان لبشرٍ ان یُکلّمہُ اللہُ اِلّا	کسی انسان کی یہ مجال نہیں کہ خدا اُس سے دبالمقابل
وحیًا اومن وراءِ حجابٍ اویُرسِلَ	ہو کر) گفتگو کرے، لیکن وحی کے ذریعہ سے یا پردہ
رسُولًا فیوحیَ باذنہٖ ما یشاءُ	کی آڑ سے یا یہ کہ وہ کسی قاصد کو بھیجے جو اللہ کے حکم سے جو
انّہٗ علیٌّ حکیمٌ ؁	کچھ وہ چاہے پہنچائے، بے شبہ اللہ تعالیٰ بلند اور حکیم ہے۔

اس آیت میں کلام الٰہی کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ وحی کے ذریعہ سے کلام، پس پردہ کلام، اور کلام بذریعہ

؁ یہ آیت مشکلاتِ قرآن میں سے ہے۔ اشکال یہ ہے کہ اس آیت میں کلام الٰہی کو مقسم قرار دے کر اُس کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں اور اقسام شے چونکہ آپس میں قسیم ہوتے ہیں اس لیے وہ ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ اس بنا پر خدا کا جو کلام بذریعۂ ارسال رُسُل ہوگا اُس کو وحی نہیں کہہ سکتے، حالانکہ قرآن مجید سب کا سب بواسطہ رسول (جبرئیل) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور وہ وحی ہے۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ "اویُرسِلَ رسُولًا فیوحیَ باذنہٖ ما یشاءُ" میں "فیوحی" کو "ارسال رُسُل" پر متفرع کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی خود ارسال رسل کی ایک قسم ہے، حالانکہ آیت کے پہلے حصہ میں کلام اللہ کو تین قسموں پر منقسم کر کے وحی کو ارسال رسل کا قسیم بتایا گیا ہے۔ تو اب قسم شئے کا قسیم شئے بنا لازم آگیا، وہو محال۔ حضرت الاستاذ العلام مولانا السید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے مشکلاتِ قرآن پر اپنی یادداشتوں میں اس آیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور اس آیت کی تقریر اس طرح کی ہے کہ اشکال خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ تقریر چونکہ مختصر ہے اس لیے ہم افادۂ علمی کی نیت سے اُسے بعینہٖ ذیل میں نقل کرتے ہیں: "اِلّا وحیًا" اس سے مُراد ہے بہ طریق وحی یعنی مصدر بیانِ نوع کے لیے ہے، اور چونکہ خدا نے اس وحی کی اسناد اپنی طرف کی ہے، اور ما بعد کی دو قسموں کو اس کا مقابل ٹھہرایا ہے اس لیے اس وحی سے مراد القاء فی القلب ہے اور نفث فی الروع (دل میں پھونکنا یا ڈالنا) خواہ یہ بحالت بیداری ہو یا بحالتِ خواب۔ اس مخصوص مراد کی وجہ سے وحی کی یہ قسم اپنے دونوں قسیموں سے ممتاز ہو گئی "او من وراءِ حجاب" اس سے مُراد ہے کلام پسِ حجاب اس طرح کرنا کہ متکلم تو نظر آئے نہیں اور ایک غیبی آواز سنائی دے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سُنا یا شبِ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا۔ "او یرسل رسولًا فیوحی" اس میں "ایحاء" کی اسناد خدا کی طرف نہیں بلکہ رسول کی طرف ہے۔ اس لیے مراد یہ ہوئی کہ اس صورت میں فرشتہ پیغمبر سے بالمشافہ گفتگو کرتا ہے، اس تنقیح سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ ایحاء اول الذکر وحی سے متغائر ہے۔ یعنی ایک وحی بلا واسطہ ہے اور دوسری بواسطہ اور مقابلۃ الشیٔ لنفسہ کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ (مشکلات القرآن ص ۲۲۲، ۲۲۳)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قاصد۔ ان تین قسموں میں سے کسی نہ کسی طریقہ کلام سے ہر پیغمبر کو شرفِ خطاب عطا فرمایا گیا ہے، حضرت موسیٰ کو کلام پسِ پردہ کے شرف سے نوازا گیا کہ وادیٔ سینا کے ایک درخت سے صوتِ ربانی اُن کے لیے سامعہ نواز ہوئی کلامِ الٰہی کا یہ طریقہ ایک خاص صورت رکھتا تھا، اس لیے قرآنِ مجید میں اس کو اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا، ارشاد ہے۔

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا ۔ اور خدا نے موسیٰ سے خوب کلام کیا۔

باقی رہیں دو صورتیں تو وہ تمام پیغمبروں کے لیے پائی گئی ہیں اور قرآنِ مجید میں ان کا جگہ جگہ ذکر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تینوں قسم کے طریقہائے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا تھا بعض نادان کہتے ہیں کہ کلام کے لیے نُطق کی ضرورت ہے۔ اور نطق بغیر اعصاب وعضلات کے ہو نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اگر خدا متکلم ہے تو اُس کے لیے بھی اعصاب وعضلات ماننے پڑینگے۔ حالانکہ خدا اس سے بلند وبالا ہے۔ اس قسم کا اعتراض سراسر تعصب پر مبنی ہے، یا جہالت ونادانی پر۔ کیونکہ کلام کا منشا صرف اس قدر ہے کہ اُس کے ذریعہ مافی الضمیر کا اظہار کیا جائے۔ خواہ یہ اظہار اصوات وحروف کے ذریعہ ہو، یا علامات واشارات کے ذریعہ کلام اور نطق کو مترادف سمجھنا انتہا درجہ کی ناواقفیت ہے۔ ارباب خبر جانتے ہیں کہ فوجوں میں جھنڈیوں، شیشوں اور اشاروں سے گفتگو کی جاتی ہے۔ اور اسی طرح خبریں پہنچائی جاتی ہیں، اسٹیشنوں پر بازاروں میں، ٹریفک کے مواقع پر سبز اور سُرخ روشنیوں سے الفاظ وحروف کا کام لیا جاتا ہے۔ انسان جب تک الفاظ وحروف سے آشنا نہیں ہوا تھا، وہ گفتگو کے مواقع پر ہاتھ اور آنکھ کے اشاروں سے مافی الضمیر کا اظہار کرتا تھا۔ ظاہر ہے یہ تمام علامات واشارات معانی پر دلالت کرنے کے باوصف غیر ملفوظ وغیر منطوق ہیں لیکن اگر ان معانی کو کسی دوسرے تک منتقل کیا جائے تو پھر یہ معانی الفاظ وحروف کا جامہ پہن لینگے تاہم ان کی نسبت اُسی شخص کی طرف ہوگی جس نے بولے بغیر کسی علامت کے ذریعہ آپ کو وہ معانی بتائے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مزید توضیح کے لیے ایک مثال اور سن لیجیے۔ تار گھر میں آپ نے دیکھا ہوگا تار بابو ایک آلہ (جس کو انگریزی میں "ڈیمی" کہتے ہیں) کے پاس بیٹھ کر انگلیوں کی حرکت سے اُس آلہ کو جنبش دیتا ہے، اُس کی اس جنبش سے کسی دوسرے شہر میں تار وصول کرنے والا بابو محض گرگٹ، گرگٹ کی آواز سنتا ہے، اور تار کا تمام مضمون معلوم کر لیتا ہے۔ پھر جب وہ اس مضمون کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا ہے تو مسلسل ایک بامعنیٰ عبارت یا جملہ بن جاتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھیے کہ گرگٹ گرگٹ کی آواز کے ذریعہ تار کا مضمون صحیح صحیح معلوم کر لینا، تار وصول کرنے والے (Receiver) بابو کی لیاقت و قابلیت پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر یہ بابو قابل ہے تو مضمون کا ایک ایک حرف ہی وہ وصول نہیں کرتا بلکہ عبارت کا کاما اور ڈیش تک بھی صحیح صحیح وصول کر لیتا ہے۔ پس اسی پر انبیاء اور رسل کو قیاس کر لیجیے ذاتِ حق میں اور اُن میں ایک خاص قسم کا معنوی تعلق ہونے کی وجہ سے ان میں اس بات کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے کہ مبداء فیاض کی جانب سے جن معانی و مطالب کا فیضان ایک خاص انداز میں ان کے نفوس طاہرہ پر ہوتا ہے وہ انہیں پورے طور پر سمجھ لیں اور چونکہ کسی معنیٰ کا ذہن میں خطور بغیر الفاظ کے نہیں ہوتا۔ اس لیے انبیاء کرام جب ان معانی کو سمجھتے ہیں تو اس حالت میں سمجھتے ہیں کہ وہ معانی الفاظ کے ساتھ متکیف اور اُن کے جامہ میں ملبوس ہوتے ہیں۔ معانی اور الفاظ میں ایسا گہرا تعلق ہے کہ اُن میں زمانہ کے اعتبار سے آپ کوئی تقدم و تاخر نہیں مان سکتے۔ بلکہ یہ کہنا پڑے گا کہ جس آن میں معانی کا القاء ہو رہا ہے اُسی آن میں الفاظ بھی منجانب اللہ نازل ہو رہے ہیں۔

جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ جو وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی تھی، احادیث میں اُس کی مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں اُن میں ایک صورت "صلصلۃ الجرس" (گھنٹہ کی آواز) بھی بتائی گئی ہے۔ محدثین اور اربابِ تصوف نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کی مختلف توجیہیں کی ہیں۔ لیکن حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی جو توجیہ کی ہے، اُس سے مندرجہ بالا تار والی تمثیل کی تصدیق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وتائید ہوتی ہے، فرماتے ہیں: وصلصلۃ الجرس ھٰھنا کنقرات التلغراف لاداء الرسالۃ (اورنزول وحی کے وقت جو گھنٹہ کی سی آواز آتی تھی، تو وہ ٹیلیگرام کی گھڑگھڑاہٹ کی طرح ہے جو پیام پہنچانے کے لیے کی جاتی ہے[1])

اس تقریر سے اس شبہ کا بھی ارتفاع ہوجاتا ہے کہ صرف انبیار کی ہی ایسی کیا خصوصیت ہے کہ اللہ انہی سے کلام کرسکتا ہے، کسی اور سے نہیں۔ جواب یہ ہے کہ جس طرح ڈمی کی گھڑگھڑاہٹ سے مضمون وہی معلوم کرسکتا ہے جو اپنی تعلیمی قابلیت کی وجہ سے اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ماوشما اُس کو نہیں جان سکتے۔ اسی طرح اللہ کا کلام صرف وہی نفوس قدسیہ معلوم کرسکتے اور سمجھ سکتے ہیں جن میں خدا کے فضل وکرم خاص سے ایسی روحانی لطافت وپاکیزگی ودیعت رکھی گئی ہو کہ وہ حقیقت الٰہیہ سے شرفِ خطاب حاصل کرسکیں۔ اس کے لیے جسمانی اور مادی کانوں کی نہیں بلکہ روحانی وباطنی سامعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اُس کا ادراک ذہنی ودماغی قویٰ سے نہیں بلکہ قلب کی ایک مخصوص قوت کے ذریعہ ہوتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ انبیار کرام میں جسمانیت اور روحانیت کا ایسا پاکیزہ امتزاج ہوتا ہے کہ وہ اللہ اور اُس کی مخلوق کے درمیان سفارت ورسالت کی صحیح خدمات انجام دیتے ہیں۔ اپنی مادی ترکیب کے لحاظ سے وہ بشر ہوتے ہیں لیکن کمالِ روحانیت کے باعث ارشادات غیبی کو سُنتے اور اُنہیں بندگانِ خدا تک بے کم وکاست پہنچاتے ہیں۔ بجائے انبیار کے اگر خود فرشتے بھی دنیا میں اس خدمت کے لیے آتے تو یہ کام نہ کرسکتے تھے۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے

ولو جعلنٰہ ملکاً لجعلنٰہ رجلاً اور اگر ہم کسی فرشتہ کو نبی بناتے تو اُسے بھی مرد بناتے۔

قاضی بیضاوی نے اسی مسئلہ کو ایک بہترین مثال سے سمجھایا ہے۔ آیت واذ قال ربک للملٰئکۃ

---

[1] مشکلات القرآن ص ۲۳۴۔

© rasailojaraid.com

اِنّی جاعِلٌ فی الارض خلیفۃ " کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں

الا ترئ اَنَّ الانبیاءَ لما فاقت قوتھم واشتعلت قریحتھم بحیث یکاد زیتھا یضیٔ ولو لم تمسسہ نارٌ ارسل الیھم الملائکۃَ ومن منھم اعلیٰ رتبۃً کلّمہٗ بلا واسطۃٍ کما کلّم موسیٰ علیہ السلام فی المیقات و محمدًا صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ المعراجِ ونظیر ذالك فی الطبیعۃِ اَنَّ العظم لما عجز عن قبول الغذاءِ من اللحم لما بینھما من التباعد جعل الباری تعالیٰ بحکمتہ بینھما الغضروفَ المناسبَ لھما لیاخذ من ھذا ویعطی ذالك

تم جانتے ہو کہ چونکہ انبیاء کی قوتِ فائق اور اُن کی طبیعت اس قدر روشن ہوتی ہے کہ گویا زیتون کا تیل آگ چھوئے بغیر خود بخود چمک رہا ہے اس لیے اللہ ان کے پاس فرشتے بھیجتا ہے، اور جو زیادہ اونچے مرتبے والے ہوتے ہیں اُن سے بے واسطہ کلام کرتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ سے میقات میں اور محمد صلعم سے شب معراج میں کیا۔ طبعیات میں اس کی نظیر یہ ہے کہ چونکہ تباعد کی وجہ سے ہڈی گوشت سے قبول غذا نہیں کرسکتی تھی، اس لیے اللہ نے اپنی حکمت سے ان دونوں (گوشت اور ہڈی) کے درمیان چبنی ہڈی پیدا کردی جو دونوں سے مناسبت رکھتی ہے اور جو غذا اس سے لیتی ہے اور اُس کو دیتی ہے۔

اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ منصب نبوت میں کسی انسان کے کسب کو دخل نہیں ہے۔ بلکہ یہ محض خدا کی دین اور اُس کے فضل و کرم پر منحصر ہے، وہ جس کو چاہتا ہے خلعتِ نبوت سے سرفراز فرما دیتا ہے، خود اُس نے فرمایا ہے

اللہ اعلم حیث یجعلُ رسالتہٗ — اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنا رسول کس کو بنائے

فلاسفہ نے نفس قدسی کے اثبات کے لیے جو دلائل قائم کئے ہیں۔ انہی دلیلوں سے نبوت کا اثبات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا جاسکتا ہے۔ اور مزید برآں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نفس قدسیہ کے لیے بھی بہتیرے مدارج و مراتب ہیں اور اس نفس قدسی کے انتہائی مرتبہ "قدوسیت" میں جو ذات ہوگی وہی نبی کہلائیگی لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کا صاحبِ نفس قدسیہ ہونا ہی کسبی نہیں بلکہ محض وہبی ہے، تو پھر کسی انسان کا نبی یا رسول ہونا کس طرح کسبی ہو سکتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ کے "باب حقیقۃ النبوۃ و خواصہا" میں نبوت سے متعلق ایک عجیب دلپذیر تقریر کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں جو لوگ تہذیب نفس، تربیت اخلاق، اور اقامت عدل و صواب کا کام کرتے ہیں اُن کے متعدد طبقات ہیں کوئی اُن میں کامل کہلاتا ہے اور کوئی حکیم کسی کو خلیفہ کہا جاتا ہے اور کسی کو المؤید بروح القدس، کسی کو امام کہتے ہیں اور کسی کو نذیر۔ حضرت شاہ صاحب نے ان سب کی تعریف کی ہے۔ اور ان کے مقاماتِ عمل و خصوصیات کو بیان فرمایا ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں۔

> "اور جب حکمت الٰہیہ اس بات کا اقتضا کرتی ہے کہ وہ دنیا میں کسی ایک معلم (مفہم) کو بھیجے اور اُس کو لوگوں کے لیے ظلمت سے نکل کر روشنی میں آنے کا ذریعہ بنائے اور لوگوں پر اُس کی اطاعت فرض کرے۔ اور ملاءِ اعلیٰ میں یہ امر موکد کر دے کہ جو لوگ اُس کے مطیع و منقاد ہونگے اُن سے وہ راضی ہوگا اور جو اُس سے انحراف کرینگے اُن پر اُس کی لعنت ہوگی اور لوگوں کو اس کی خبر بھی دیدے، پس وہ نبی ہے۔ پھر انبیاء میں سب سے زیادہ عظیم الشان نبی وہ ہے جس کو ایک اور طرح کی بعثت حاصل ہو، وہ یہ کہ نبی کی ذات لوگوں کے لیے ظلمت سے نکل کر روشنی میں آنے کا ذریعہ ہو اور دوسری جانب اُس کی قوم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کی ہدایت اور اُن کے ارشاد کے لیے پیدا کی گئی ہو"

مزید توضیح کے لیے یہ سمجھیے کہ فلسفۂ اخلاق کی رو سے انسان میں تین قوتیں ہیں جن کے اعتدال سے فضائل اور بے اعتدالی سے رذائل پیدا ہوتے ہیں۔ اُن تین قوتوں کا نام قوت نظری، قوت شہوی اور قوتِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غضبی ہے۔ حکماء یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اعتدال و عدم اعتدال کے لحاظ سے انسانی ملکات کی بیشمار قسمیں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی جانب نقصان و کمال ہیں دو مرتبے ایسے نکلینگے جن کے اوپر کوئی مرتبہ نہیں ہوگا ہم ان دونوں مرتبوں کو "انتہائی غیر معتدل" اور "انتہائی معتدل" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ فلاسفہ یہ بھی کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں کہ اعتدال کلّی تو پایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لیے "انتہائی معتدل" سے مراد یہ ہے کہ اعتدال کلّی و حقیقی سے اتنا قریب ہو کہ اور اس سے زیادہ قریب نہ ہو سکتا ہو۔ ہمارے نزدیک اس مرتبہ کا مجموعی اعتدال انبیاء کرام کی ذات کے سوا کسی اور میں نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن سے نہ کسی گناہ کا صدور ہوتا ہے اور نہ وہ کسی حق کو باطل یا باطل کو حق سمجھ سکتے ہیں۔

اب اس پر اس مقدمہ کا اور اضافہ کر لیجیے کہ چونکہ اعتدال کا یہ مرتبہ کسبی نہیں بلکہ محض وہبی ہے اس لیے معلوم ہوا کہ نبوت بھی کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اس مرتبہ سے نوازتا ہے اور پھر جب اس مرتبہ سے کسی کو نوازتا ہے تو ساتھ ہی اُس کے تمام اقوال و اعمال کی نگرانی کرتا ہے۔ اور اسی بنا پر اُس سے کوئی ایسا کام سرزد نہیں ہو سکتا جو شانِ نبوت کے خلاف ہو۔ وہ جس چیز کو خدا کا کلام کہیگا، بے شبہ وہ خدا کا کلام ہوگی، اس میں اُس سے بھول چوک اور نسیان و خطا نہیں ہو سکتی۔ وہ دنیا میں خدا کی طرف سے آتا ہی اس لیے ہے کہ انسانوں کے اور خدا کے درمیان سفارت و رسالت کی خدمات انجام دے۔ اور خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچائے۔

اب یہاں قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود نبی تک اللہ کا کلام کس طرح پہنچتا ہے؟ تو اجمالی طور پر ایک آیت کے حوالہ سے یہ بتایا جا چکا ہے کہ خدا بشر سے کس کس طرح کلام کرتا ہے، یہاں ہم کسی قدر تفصیل سے یہ بتائینگے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کن مختلف طریقوں سے آتی رہی ہے۔

آپ پر وحی کا آغاز سچّے خواب یعنی رویائے صالحہ کے ذریعہ ہوا۔ صحیح بخاری کے پہلے باب میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِہٖ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مِنَ الوحی الرؤیا الصالحۃُ فی النوم فکان لا یری رؤیا اِلّا جاءت مثل فلق الصبح[1]

آنحضرت صلعم پر وحی کا آغاز نیند میں رویائے صالحہ کے ذریعہ ہوا حضور جو خواب دیکھتے تھے وہ صبح کے تڑکے کی طرح صحیح نکلتا تھا۔

حافظ ابن حجرؒ خواب سے وحی کے آغاز کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ عالم بیداری میں حضور پر جو وحی نازل ہونے والی تھی اُس کے لیے بطور تمہید د توطیہ پہلی وحی خواب کے ذریعہ نازل کی گئی۔ اس کے بعد آپ پر وحی مختلف طریقوں سے نازل ہوتی رہی۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے "زاد المعاد" میں نزول وحی کی سات صورتیں لکھی ہیں۔ پہلی تو وہی ہے جس کا ذکر ابھی ہوا۔ اس کے علاوہ بقیہ چھ ترتیب وار یہ ہیں

(۱) فرشتہ آپ کے قلب میں بغیر نظر آئے کسی بات کا القا کر دیتا تھا۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں " روح القدس نے میرے قلب میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی نفس اُس وقت تک نہیں مریگا جب تک کہ وہ اپنے رزق کی تکمیل نہیں کرلیگا۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور طلب میں خوش روشی سے کام لو۔ اور خبردار رہو کہ کہیں رزق کا متاخر ہوجانا تم کو اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم اللہ کی معصیت کی راہ سے اُس

---

[1] یہ واضح رہنا چاہیے کہ انبیاء کرام کا خواب ہمارے خواب کی طرح اور اُن کی نیند ہم لوگوں کی نیند کی مانند نہیں ہوتی۔ اس حالت میں اُن کی آنکھیں اگرچہ بند ہوتی ہیں لیکن دل بیدار ہوتا ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے۔

تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم۔ اُن کی آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی نسبت بیان فرماتے ہیں: تنام عینی ولا ینام قلبی۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ عربی زبان میں رویا صرف اُس خواب کو کہتے ہیں جو کسی حقیقت کے اخبار و اعلام یا اُس کی جانب اشارہ و ایما پر مبنی ہو۔ عام خواب کے لیے "حُلُم" بولا جاتا ہے جس کی جمع احلام آتی ہے۔ انہی خوابوں میں جو خیالاتِ پریشاں کے درجہ کے خواب ہوتے ہیں وہ "اضغاث احلام" کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ تینوں لفظ سورۂ یوسف کی ایک آیت میں جمع ہوگئے ہیں اور سیاق و سباق سے مذکورہ بالا فرق واضح ہوجاتا ہے لیکن حضرت شاہ صاحبؒ[ع] کی تحقیق یہ ہے کہ رویا کے معنی خواب کے نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ایسی حالت کا نام ہے جو نہ پورے طور پر بیداری ہے اور نہ کامل نیند، بلکہ ان دونوں کی ایک درمیانی حالت ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں "یہ میرا اپنا ذاتی خیال تھا لیکن مدت کے بعد فرید وجدی کی دائرۃ المعارف دیکھنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ میں نے رؤیا کی حقیقت جو سمجھی تھی وہ بعینہ محققین یورپ کی تحقیق ہے۔ (فیض الباری ج ۱ ص ۲۲)

ع حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رزق کو طلب کرو۔ کیونکہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اُس کی طاعت و بندگی سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

(۳) تیسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسان کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا اور وہ آپ سے خطاب کرتا تھا یہاں تک کہ آپ کو وہ پوری بات یاد ہو جاتی تھی جو وہ آپ سے کہتا تھا جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرتِ عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا جس کے کپڑے بہت زیادہ سفید اور بال بہت سیاہ تھے اور اُس پر سفر کی کوئی علامت بھی نہیں پائی جاتی تھی اور ہم میں سے کوئی شخص اُس کو نہیں جانتا تھا۔ یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اس طرح بیٹھ گیا کہ اپنے گھٹنے حضور کے گھٹنوں پر ٹیک لیے اور اپنے دونوں ہاتھ آنحضرت کی رانوں پر رکھ دیے پھر اسلام، ایمان احسان، قیامت اور علاماتِ قیامت سے متعلق آپ سے چند سوالات کیے۔ آپ اُن کا جواب دیتے جاتے تھے اور سائل ہر جواب پر "صَدَّقْتَ" (آپ نے سچ فرمایا) کہتا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "ہمیں بڑا تعجب ہوتا تھا کہ یہ شخص سوال کرتا ہے، اور جواب ملنے پر تصدیق بھی کرتا جاتا ہے، گویا کہ اُسے ان سوالات کے جوابات پہلے سے ہی معلوم تھے، سوال و جواب کے ختم ہونے پر یہ شخص واپس چلا گیا تو آنحضرتؐ نے حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا "تم جانتے ہو یہ کون شخص تھا؟" اُنہوں نے جواب دیا "اللہ اور اُس کا رسول اعلم ہیں۔ آپ نے فرمایا "یہ جبریل تھے تم کو دین سکھانے آئے تھے"۔

صحابہ میں حضرت دحیہؓ خوبصورتی اور حسن و جمال کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ اس لیے فرشتۂ وحی حضرتِ جبریلؑ ان کی شکل میں بھی آتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے کہ ایک مرتبہ جبریل امین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور باتیں کرنے لگے، اس وقت آنحضرتؐ کے پاس اُم سلمہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپ نے اُم سلمہ سے پوچھا "یہ کون ہیں"۔ وہ بولیں "یہ تو دحیہ ہیں" اُم سلمہ فرماتی ہیں "بخدا میں انہیں دحیہ ہی سمجھتی رہی یہاں تک کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سُنا جس میں آپ نے جبریل امین کے آنے کی خبر دی تب میں سمجھی کہ جبریل امین دحیہ کی شکل میں آئے تھے[1]۔

[1] باب کیف نزل الوحی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت عائشہؓ کے ساتھ پیش آیا۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے آنحضرتؐ کو دیکھا کہ کسی شخص سے بات چیت کر رہے ہیں جو کسی سواری پر سوار ہیں۔ جب آپ گھر میں تشریف لائے تو حضرتِ عائشہ نے پوچھا "یہ کون تھا جس سے آپ گفتگو کر رہے تھے" آپ نے فرمایا "وہ جبریل امین تھے۔ اُنہوں نے مجھ کو حکم کیا ہے کہ میں بنو قریظہ کی طرف چلا جاؤں"[1]

(۳) تیسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ صلصلۃ الجرس یعنی گھنٹہ کی آواز کی طرح آتا تھا۔ صلصلۃ الجرس سے کیا مراد ہے؟ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ آپ پر یہ حالت بہ نسبت اور حالتوں کے زیادہ سخت ہوتی تھی، شدید سردی کے موسم میں بھی آپ پر اس حالت کا اتنا اثر ہوتا تھا کہ آپ کی جبینِ مبارک عرق آلود ہو جاتی تھی اور اگر آپ کسی سواری پر ہوتے تھے تو بوجھ کے مارے وہ زمین پر بیٹھ بیٹھ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ آنحضرتؐ پر اسی طرح وحی آئی۔ حضرت زید بن ثابتؓ اُس وقت آپ کے پاس اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ سرورِ کائنات کا فرقِ مبارک اُن کی ران پر رکھا ہوا تھا۔ حضرت زید پر وحی کا اتنا بار ہوا کہ اُن کا جسم دبا جاتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پارہ پارہ ہو جائیگا۔

حضرتِ عبادہ بن صامتؓ کا بیان ہے کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کو اضطراب پیدا ہو جاتا، چہرۂ مبارک کا رنگ بدل جاتا، آپ سر جھکا لیتے اور جو صحابہ آپ کے پاس بیٹھے ہوتے تھے وہ بھی سر نیچا کر لیتے تھے۔ وحی کے بعد آپ سر اُٹھاتے تھے[2]۔ صفوان بن یعلیٰ بن اُمیہ بیان کرتے ہیں کہ یعلیٰ کو بڑی خواہش تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی ہوئی دیکھیں۔ ایک مرتبہ جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں تھے یعلیٰ کو یہ سعادت نصیب ہو گئی۔ آنحضرتؐ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت تھی، اسی حالت میں ایک شخص آپ کے پاس آیا جس نے خوشبو لگا رکھی تھی، اور سوال کیا۔ "اے رسول اللہ! آپ اُس شخص کی نسبت کیا فرماتے ہیں جس نے ایک جبہ میں ہی احرام کی نیت کر لی درآنحالیکہ اُس میں خوشبو بھی لگی ہوئی تھی

---

[1] یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں "کیف نزل الوحی" کے ماتحت ہی بیان کیا ہے [2] صحیح مسلم باب عرق النبی صلعم۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آنحضرت نے تھوڑی دیر وحی کا انتظار فرمایا، یہاں تک کہ آپ پر اچانک وحی آگئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ حضور کا چہرہ سُرخ ہو گیا ہے، اور آپ زور زور سے سانس لے رہے ہیں (جیسے کوئی شخص تھکا ہوا ہو) تھوڑی دیر کے بعد جب یہ کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے سائل کو بلا کر اُس کے سوال کا جواب دیا[1]۔

ایک سوال اور اُس کا جواب اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وحی وحی تو سب برابر ہیں پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ آپ پر وحی کی یہ خاص قسم صلصلۃ الجرس بقیہ اقسام وحی کی نسبت زیادہ گراں گذرتی تھی۔ آپ اگر ایک نوعِ وحی کا تحمل بآسانی کر سکتے تھے، تو اس نوع کا تحمل کیوں دشوار ہوتا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے، کہ انسان میں دو قوتیں ہیں ایک قوتِ بشریت اور دوسری قوتِ ملکیت، اور جب فرشتے اُن نفوس پر نازل ہوتے ہیں جو نبوت کی استعداد رکھتے ہیں تو ظلمت بشری سے نکل کر عالمِ نور میں آنے کی وجہ سے اُن کو سخت کشمکش اور مزاحمت باطنی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کشمکش کی وجہ سے اُن کے تمام اعصاب متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال اس طرح سمجھیے کہ انسان نیند کی حالت میں کوئی عظیم خواب دیکھتا ہے تو اگرچہ اُس خواب کا تعلق اُس کے جسم سے نہیں ہوتا لیکن نفس کے تعلق بالجسم کے باعث اُس خواب کا اثر جسمانی اعضاء و جوارح پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے صلصلۃ الجرس کی تشریح بھی اسی تاثر و انفعال کی روشنی میں کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

اما الصلصلۃ فحقیقتہا ان الحواس	رہا صلصلۃ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ حواس سے جب
اذا صادمہا تاثیر قوی تشوشت	کوئی تاثیر قوی متصادم ہوتی ہے تو وہ مشوش ہو جاتے
فتشویش قوۃ البصر ان یری الوانا	ہیں، چنانچہ قوتِ بصر کی تشویش یہ ہے کہ مختلف رنگ
الحمرۃ والصفرۃ والخضرۃ ونحو ذلک	مثلاً سُرخی، زردی اور سبزی نظر آئیں اور قوت
وتشویش قوۃ السمع ان یسمع اصواتا	سمع کی تشویش یہ ہے کہ مبہم آوازیں سُنائی دیں

[1] صحیح بخاری باب نزل القرآن بلسان قریش ج۲ ص ۲۰۵ جدید اڈیشن۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مبہمۃً کالطنین والصلصلۃ و الھمھمۃ فاذا اتہ آلاو ثر حصل العلم[1] — مثلاً طنین، صلصلۃ اور ہمہمہ، اور پھر جب اثر تام ہوجاتا ہے تو علم حاصل ہوجاتا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں ہی ایک دوسرے مقام پر باب الایمان بصفات اللہ تعالیٰ کے ماتحت اسی مضمون کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

وربما یحصل عند توجھہ الی الغیب وانقھار الحواس صوت صلصلۃ الجرس کما قد یکون عند عروض الغشی من رویۃ الوان حمر وسود — اور بسا اوقات نبی کے غیب کی طرف متوجہ ہونے اور حواس کے مغلوب ہونے کی صورت میں گھنٹہ کے بجنے کی سی آواز آتی ہے جیسا کہ غشی کے عالم میں سُرخ اور سیاہ رنگ نظر آتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی مُراد یہ ہے کہ یہ وہ خاص وقت ہوتا تھا جبکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم عالمِ مادیت سے منزہ و مبرا ہوکر ملا اعلیٰ سے بہت زیادہ قریب ہوتے تھے اور اُس وقت اگرچہ آپ کے حواس ظاہری میں تشویش پیدا ہوجاتی تھی۔ لیکن آپ کی تمام روحانی قوتیں، باطنی احساس و شعور اور ملکوتی صفات و خصائص پورے طور پر بیدار رہ کر عالم لاہوت کے جلوہ زار میں پہنچ جاتے تھے۔ اور وہاں آپ وہ سنتے تھے جسے دوسرے نہیں سُن سکتے۔ اور اُن حقائق سے علی وجہ الیقین آشنا ہوتے تھے جن کو نہ مادی حواس محسوس کرسکتے ہیں اور نہ جسمانی آلاتِ شعور انہیں دریافت کرسکتے ہیں، اور چونکہ اس وقت آپ کی جہتِ بشری اور جہت ملکوتی میں تصادم ہوتا تھا اس لیے اُس کا اثر آپ کے اعصار و اعصاب پر بھی پڑتا تھا۔ اور اُس اثر کے باعث آپ کو گھنٹہ کی سی آواز سنائی دیتی تھی، جبین اقدس عرق آلود ہوجاتی تھی۔ اور اس تاثر میں اس درجہ شدت ہوتی تھی کہ آپ کے پاس جو صاحب بیٹھے ہوتے تھے اُنہیں بھی اس حالت کا بیّن طور پر احساس ہوتا تھا۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۲۰۶ جدید اڈیشن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب یہ کشمکش ختم ہوجاتی تھی، تو آپ کی یہ حالت یعنی اعصاب کا تاثر بھی زائل ہوجاتا تھا۔ اور تمام وحی من وعن آپ کو یاد ہوجاتی تھی۔ چنانچہ

فیفصم عنی وقد وعیتُ عنہ   وحی مجھ سے جب منقطع ہوتی تھی تو مجھ کو اُس وقت سب کچھ یاد ہوتا تھا۔

فرما کر آپ نے اس امر کا ہی اظہار فرمایا ہے کہ لوگوں کو صلصلۃ الجرس کے لفظ سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ محض آواز سُنتے تھے اور وحی کا مضمون سمجھتے نہیں تھے، یا وحی کا مضمون اُس وقت سمجھ لیتے تھے، لیکن بعد میں وہ آپ کو محفوظ نہیں رہتا تھا۔ غور کیجیے بصیغۂ ماضی وعیت فرمانا اس مضمون کو زیادہ موکد اور موثق طریقہ پر بیان کرنے کے لیے ہی ہے۔

(باقی)

تصحیح

برہان کی گذشتہ اشاعت میں صفحہ ۲۰۴ پر فارسی کے دو شعر غلطی سے انوری کی طرف منسوب کردیے گئے ہیں۔ یہ شعر انوری کے نہیں بلکہ عرفی کے ہیں۔ قارئین کرام تصحیح کرلیں۔

© rasailojaraid.com